Habib Kareem

یہ زباں بندی کا ایسا عہد ہے کہ لب کشائی انتہائی مشکل ہے، مگر خاموش رہنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ ایسے وقت میں بولنا ہی شاید زندگی کی ضمانت ہو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے گرد گھیرا تنگ تر ہو گیا ہے۔ محض ”مثبت خبروں“ کا ہی دور دورہ ہے۔ تقریر و تحریر کی باقی ہر شکل زنداں میں قید ہے۔ حکم ہے کہ صرف حاکم کہا لکھا جائے، اور اُسی کا لکھا پڑھا جائے۔ اور یوں چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔

اور یہ رسم کوئی نئی نہیں ہے۔ تقسیمِ ہند اور پاکستان کے قیام کے بعد سے ہی یہاں آزادیِ اظہار رائے پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ اس میں شدّت تب آئی جب سن پچاس کی دہائی میں صدر سکندر مرزا نے اسمبلیاں تحلیل کرتے ہوئے مارشل لاء لگا دیا۔ مارشل لاء کے لیے سٹیج سجانے کے واسطے صدر سکندر مرزا نے بے بنیاد خبر پھیلائی کہ خانِ قلات بلوچستان میں کثیر فوج اور ہتھیار جمع کر کے بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یوں ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے یہ جھوٹ پھیلا کر بلوچستان میں فوج کشی کی گئی۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا، اگلے دن ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اور ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوا۔

ایوب خان نے 1962 میں پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس (پی پی او) کے ذریعے آزادیِ اظہارِ رائے کا گلا گھونٹا۔ سرکش اخبارات کو بند کر دیا گیا۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی ایوب آمریت کے ان جابرانہ اقدامات کو جاری رکھا گیا۔ روزنامہ ڈان، روزنامہ جسارت اور کئی دیگر اخبارات کے مدیروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایوب خان کے بنائے ہوئے نام نہاد خود مختار ادارے نیشنل پریس ٹرسٹ کو بھٹو صاحب کی حکومت نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا کہ ضیاء الحق کی آمریت آئی اور اس آمریت کے خلاف توانا آواز اٹھانے والے ہر شخص پر ظلم و جبر کے پہاڑ توڑ دئیے گئے۔

ضیاء آمریت میں حکومت مخالف دانشوروں، طلبہ، سیاسی کارکنوں اور صحافیوں پر کوڑے برسائے گئے۔ ایوب خان کے پی پی او کو ریوائزڈ پریس اینڈ پبلیکیشن آرڈیننس (آر پی پی او) کا نام دیا گیا۔ اور اس بدنام زمانہ آرڈیننس کے تحت حکومت مخالف ہر خبر پر پابندی لگا دی گئی۔ جس پیکا آرڈیننس کے ذریعے آج عمران خان کی مارشل لاء زدہ حکومت آزادیِ اظہار کو مکمل دبانے کے درپے ہے، یہ در اصل ماضی کی انہی آمرانہ اور جابرانہ حکمت عملیوں کا تسلسل ہے۔ جس پیمرا کا قیام جنرل پرویز مشرف کی آمریت میں حکومتی بیانیے کی ترویج کی خاطر عمل میں لایا گیا تھا، آج پیمرا موجودہ حکومت کے لیے بھی ہو بہو وہی کردار ادا کر رہا ہے۔ اور موجودہ دور کو آزادیِ اظہارِ رائے کے لیے بدترین دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

Reporters Without Borders نے آزادیِ اظہارِ رائے کے حوالے سے دنیا کی 2021 میں 180 ممالک میں پاکستان کو 145 ویں نمبر پر رکھا۔ مارچ 2021 میں انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس (IFJ) نے پاکستان کو ذرائع ابلاغ کے لیے دنیا کا دوسرا خطرناک ترین ملک قرار دیا۔ اب حال ہی میں ہیومن رائیٹس کمیشن آف پاکستان (ایچ آر سی پی) نے بھی ایک جامع رپورٹ پاکستان میں آزادیِ اظہار رائے کی صورتحال سے متعلق جاری کی ہے۔ اِس رپورٹ کے مطابق موجودہ حکومت نے تنقیدی آوازوں کو دبانے کے لیے گزشتہ حکومتوں کی نسبت کئی گنا زیادہ ریاست کے استحصالانہ مفادات کا تحفظ کیا ہے۔

کے نام سے جاری کردہ اس رپورٹ کا تیسرا Truth Comes At A Priceایچ آر سی پی کی حصہ مین سٹریم میڈیا سے خیبر پختونخواہ اور بالخصوص بلوچستان کے بلیک آؤٹ ہونے کا Redجائزہ لیتی ہے۔ بلوچستان کو تو دہائیوں سے اربابِ اختیار کی جانب سے سرخ لکیر قرار دے دیا گیا ہے۔ بلوچستان میں عرصہ دراز سے جاری سیاسی، سماجی اور انسانی Line زندگیوں سے متعلق بحرانات کا تذکرہ کرنا اس ریڈ لائن کو پار کرنے کے مترادف بنا دیا گیا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں دولت مند اور ترقی یافتہ ممالک زیادہ تر اپنے کاروباری اور تجارتی مفادات کے لیے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہیں۔ دوسری جانب ترقی پزیر اور پسماندہ ممالک میں ذرائع ابلاغ کا کردار ''قومی سلامتی'' کے بیانیے اور اس کے تحفظ کے گرد گھومتا ہے۔ قومی سلامتی کے نام پہ تنقید، دلیل اور شعور کو قید کیا جاتا ہے۔ سچ چونکہ بحث مباحثے کو دعوت دیتا ہے، اسی لیے مطلق العنان ریاستوں کے لیے سچ سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ قومی سلامتی جیسے گمراہ کن بیانیوں کے ذریعے سچ کو ہر ممکن دبانے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ بحث مباحثے کا ماحول پروان نہ چڑھے اور نتیجتاً اربابِ اقتدار کے استحصالانہ مفادات پر سوالات نہ اٹھائے جائے سکیں۔

بلوچستان کو بھی اسی قومی سلامتی کی سرخ لکیر قرار دینے کے بعد اس کے متعلق کسی بھی قسم کی تنقیدی بحث و مباحثے کو جرمِ عظیم ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اب تو بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے بھی بلوچستان کو ''انفارمیشن بلیک ہول'' قرار دیا ہے۔ یعنی کہ ایک ایسا علاقہ جہاں سے کوئی اہم خبر باہر کی دنیا تک نہیں پہنچ پاتی۔

معروف ادیب اور دانشور انور سین رائے صاحب نے عرصہ قبل لکھا تھا کہ؛
''ہم بلوچستان کے بارے میں پورے وثوق سے ایک ہی بات کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ ہم بلوچستان کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا ایک پیدائشی نابینا شخص کسی ہاتھی کے بارے میں جانتا اور بتا سکتا ہے۔''

لیکن بلوچستان کے حوالے سے پاکستان کے دیگر خطوں میں رہنے والے افراد اور بالخصوص دانشور طبقہ کی ناواقفیت ایک خود ساختہ نابینا پن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ بلوچستان کے معدنی وسائل کے نام، اس کی جغرافیائی اہمیت سے متعلق باتیں اور اب سی پیک جیسے پراجیکٹس کی افادیت تو انہیں ازبر ہیں۔ مگر جو معلوم نہیں ہیں، وہ ہیں بلوچوں کی المناک داستانِ حیات، بلوچستان میں سات دہائیوں سے جاری عسکری مہمات، وسائل کی بے پناہ لوٹ مار، مسخ شدہ لاشوں اور اجتماعی قبروں سے متعلق وہ جرائم جنہیں جان کر انسانیت شرما جائے۔

آزادیِ اظہار رائے پر پابندیوں سے متعلق بلوچستان میں جاری موجودہ ریاستی پالیسی کوئی چند سالوں کی بات نہیں۔ انگریزوں کی یلغار اور نوآبادیاتی قبضے کے وقت سے ہی بلوچستان ایک جنگ زدہ خطہ رہا ہے۔ برطانیہ نے بھی اپنی نوآبادیات میں آزادیِ اظہار رائے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ برطانوی راج کے ناقد، نوآبادیاتی قبضے کے مخالف اور جاگیردرانہ جبر کے خلاف توانا آواز میر یوسف عزیز مگسی اور ان کے رفقاء کو ان کی تنقیدی تحریروں اور تقریروں

کے باعث قید و بند کی صعوبتیں کاٹنی پڑیں۔

1929 میں لاہور کے ایک اخبار میں یوسف عزیز مگسی نے ”فریادِ بلوچستان“ کے عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون میں انگریز کی نوآبادیاتی منصوبوں پر کڑی نکتہ چینی کی تو اقتدار کے ایوانوں میں گویا ایک بھونچال برپا ہوا۔ یوسف عزیز مگسی کو گرفتار کر لیا گیا اور مستونگ جیل میں ایک سال کے لیے پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ خان عبد الصمد خان بھی برطانوی سامراج کا نشانہ بنے۔ ان کے ہفت روزہ اخبار ”استقلال“ پر پابندی عائد کر دی گئی، انہیں گرفتار کیا گیا اور کئی برس کے لیے زنداں میں ڈال دیا گیا۔

آج بلوچستان میں آزادیِ اظہار رائے پر سخت ترین بندشیں اسی نوآبادیاتی جبر کا تسلسل ہیں۔ بلوچستان میں جاری اس مخدوش سیاسی صورتحال اور انسانی حقوق کی پامالی پر لب کشائی کرنے والا کوئی بھی شخص بمشکل ہی ان مظالم کا شکار ہونے سے بچا ہے۔ بلوچستان سے شائع ہونے والے متعدد اخبارات کو بند کر دیا گیا۔ پہلے ان کے دفاتر کے باہر فورسز کی بھاری نفری تعینات کی گئی۔ ہر آنے جانے والے کی تلاشی لینا شروع کر دیا گیا۔ بالآخر روزنامہ آساپ اور دیگر مقامی اخبارات کے مالکان کو اپنے دفاتر مکمل سِیل کر دینے پر مجبور کر دیا گیا۔

مارے جانے کے خوف سے کئی صحافیوں نے جلاوطنی اختیار کی۔ متعدد صحافیوں کو ماورائے عدالت قتل کیا گیا۔ ہزاروں طلبہ، سیاسی کارکن، اساتذہ اور دانشور کئی سالوں سے ماورائے عدالت جبری گمشدگی کا شکار ہیں۔ اور ایسے بے شمار لوگ ہیں جو سچ بولنے کی پاداش میں بے گور و کفن لاشوں کی صورت میں بے نام و نشان اجتماعی قبروں میں دفن کر دیے گئے ہیں۔

اب گزشتہ چند سالوں سے ملک کے دیگر حصوں میں سٹوڈنٹ یونینز کی بحالی کے لیے مختلف طلبہ تنظیمیں احتجاجی جلسے اور ریلیاں منعقد کر رہی ہیں۔ بلاشبہ، تعلیمی اداروں میں ترقی پسندانہ سیاسی ماحول اور آزادیِ اظہار کو پروان چڑھانے کے لیے لازمی ہے کہ سٹوڈنٹ یونینز بحال ہوں۔ مگر بلوچستان سے طلبہ کی جو آوازیں آ رہی ہیں، وہ تو ظلم اور زباں بندی کی مزید سخت ترین داستانیں سنا رہی ہیں۔

آج بلوچستان میں بلوچ طلبہ کا بنیادی اور اہم ترین مطالبہ زندگی کی بحالی کا بن چکا ہے۔ آج بلوچ طلبہ اُن ساتھی طلبہ کی زندگیوں کی بھیک مانگ رہے ہیں جنہیں کئی سالوں سے ماورائے عدالت جبراً اغوا کیا گیا ہے۔ بلوچستان کے طلبہ اپنے تعلیمی اداروں کو عسکری چھاؤنیوں میں بدلنے کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اساتذہ کی زندگیوں کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ اور اپنی زندگیوں کی بقا کے لیے سرگرداں ہیں۔

مگر مجال ہے کہ ریاستی ذمہ داران کے کانوں میں جوں تک رینگے۔ آج بھی روازنہ کی بنیاد پر بلوچ طلبہ محض علم کی پیاس بجھانے اور اپنے آئینی حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی پاداش میں لاپتہ کیے جا رہے ہیں۔ اب جب میں یہ لکھ رہا ہوں، پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں بلوچ طلبہ کا احتجاجی کیمپ یکم مارچ سے لگا ہوا ہے۔ سینکڑوں طلبہ ایک ساتھی طالبعلم حفیظ بلوچ کی بازیابی کے لیے شہرِ اقتدار کی سڑکوں پر بے یار و مددگار بیٹھے ہیں۔ بجائے کہ ان طلبہ کو سنا جاتا اور آزادیِ اظہارِ رائے کا حق انہیں ملتا، ان طلبہ پر نہ صرف بدترین تشدد

کیا گیا بلکہ الٹا انہی کے اوپر ریاست کے خلاف سازش کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ ریاست کی جانب سے بظاہر یہ ایک واضح پیغام ہے کہ اظہار کی آزادی جیسے کسی حق کا تصوّر بھی غداری سے کم نہیں۔

مگر ان تمام مظالم کے باوجود بلوچستان سے حق و سچ کی آوازیں آنا بند نہیں ہوئی ہیں بلکہ اب ان آوازوں میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب تو پورے ملک میں ایسی توانا آوازوں کی گونج پہلے سے کئی گنا زیادہ سنائی دیتی ہے۔ خوف اور جبر کے ذریعے حکومت کرنے کی منصوبے اب کارگر ثابت نہیں ہو سکتے۔ قومی سلامتی جیسے ڈھکوسلے اب روشن خیالات اور جمہور کی آواز کو دبانے کے لیے بطور استحصالی آلہ مزید استعمال نہیں ہو سکتے۔

موجودہ ڈیجیٹل اور سوشل میڈیا دور میں کہ جب اظہار و بیان کے کئی متبادل راستے موجود ہیں، آج کے نوجوان اور کسی تعلیم یافتہ ذہن کو جبراً خاموش نہیں کروایا جا سکتا۔ اور ویسے بھی روشن خیالات اور تابندہ افکار و نظریات کا راستہ آج تک بھلا کون روک پایا ہے۔ سو، آج ضرورت اس امر کی ہے کہ معلومات کے بیش بہاؤ کے موجودہ دور میں ان اہم فورمز کا درست استعمال کیا جائے۔ ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ جن محکوم طبقات اور اقوام کی آواز کو دبایا جاتا ہے، ان کی آواز بنا جائے۔ مذہبی انتہا پسندی، ریاستی دہشت گردی اور بوسیدہ سماجی روایات کے خلاف کمر بستہ ہوا جائے۔ اور جبر کی ہر شکل میں مخالفت کی جائے۔